۱۷۷۳ء میں شجاع الدولہ نے مغرب کا سفر کیا۔ اس سفر میں شاہی کیمپ کی رونق اور چہل پہل بیان سے باہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نوابی علم اقبال کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بھاری شہر سفر کر رہا ہے۔ لکھنؤ ہوتے ہوئے اٹاوہ پہنچے، جس پر مرہٹے قابض تھے۔ ایک ہی حملے میں، اُسے اُن سے چھین کے، اپنے قبضے میں کیا۔ اور احمد خاں بنگش کی قلمرو میں داخل ہوکے، کوڑیا گنج اور کاس گنج میں خیمہ زن ہوئے۔ یہاں سے انھوں نے حافظ رحمت خاں فرماں روائے بریلی کو لکھا: "گذشتہ سال میں نے ایک کروڑ روپے، مہاجی سندھیا مرہٹے کو بھیجے تھے، جس نے آپ کا وہ تمام علاقہ جو درمیانِ دوآب ہے، آپ سے چھین لیا تھا۔ وہ رقم ادا کرکے، میں نے آپ کا وہ علاقہ اس کے قبضے سے چھڑایا اور آپ کے حوالے کردیا۔ لہٰذا اب پچاس لاکھ کی رقم جو آپ کی طرف سے میں نے ادا کی تھی، فوراً ادا کیجیے۔"

حافظ رحمت خاں نے اپنے تمام افغان سرداروں اور بھائی بندوں کو جمع کرکے کہا: "شجاع الدولہ لڑائی کے لیے بہانہ ڈھونڈھ رہے ہیں، مناسب یہ ہے کہ یہ مطلوبہ رقم ادا کردی جائے۔ بیس لاکھ میں اپنے پاس سے دیتا ہوں اور مابقی تیس لاکھ تم جمع کردو۔"

ناعاقبت اندیش پٹھان سرداروں نے جواب دیا: "شجاع الدولہ کے آدمی دیکھنے ہی کے ہیں، وہ بھلا ہم سے کیا مقابلہ کریں گے؟ باقی رہی انگریزی فوج جو اُن کے ساتھ ہے، تو اُن کی توپوں پر جس وقت ہم تلواریں سُوت سُوت کے جا پڑیں گے، سب کے حواس جاتے رہیں گے۔ دینے لینے کی کچھ ضرورت نہیں۔" حافظ رحمت خاں نے یہ سن کے کہا: "تمھیں اختیار ہے، مگر میں ابھی سے کہے رکھتا ہوں کہ اگر لڑائی کا رنگ بدلا تو میں میدان سے زندہ نہ آؤں گا، اور اس کا جو انجام ہوگا، وہ تمھیں کو بھگتنا پڑے گا۔"

بہرتقدیر، شجاع الدولہ کو اپنی خواہش کے موافق جواب نہ ملا، فوج لے کے چڑھ گئے۔ لڑائی ہوئی اور لڑائی کا انجام وہی ہوا جسے تقدیر نے حافظ رحمت خاں کی زبان سے پہلے ہی سنوا دیا تھا۔ حافظ رحمت خاں شہید ہوئے اور اُن کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر یہ

فتح شجاع الدولہ بہادر کو بھی سزاوار نہ ہوئی۔ ۱۳ صفر ۱۱۸۸ھ ۱۷۷۴ء کو لڑائی ہوئی تھی، ۱۱ شعبان کو شجاع الدولہ بریلی سے کوچ کرکے لکھنؤ آئے۔ ماہِ مبارک رمضان لکھنؤ میں بسر کیا۔ ۸ شوال کو لکھنؤ سے کوچ کرکے، ۱۴ کو فیض آباد میں داخل ہوئے۔ اور فتح کو ۹ مہینے دس ہی دن ہوئے تھے اور گھر میں پورے ڈیڑھ مہینے بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ۲۳ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کو رہ گرائے عالمِ جاوداں ہوئے۔ اور افسوس، ان کی وفات ہی کے ساتھ فیض آباد کی ترقی کا دور بھی ختم ہوگیا۔

اُس وقت حکومتِ اودھ میں سب سے بڑا اثر نواب شجاع الدولہ بہادر کی بی بی، بہو بیگم صاحبہ کا تھا، جو نہایت ہی دولت مند بھی سمجھی جاتی تھیں۔ اُن کی منظوری سے نواب آصف الدولہ مسندنشینِ حکومت ہوئے۔ مگر ان کی اخلاقی حالت نہایت خراب تھی اور مصاحبوں کو مناسب معلوم ہوا کہ ماں بیٹوں کو الگ رکھیں۔ چند روز تک سیر و شکار میں مصروف رہنے کے بعد، نواب آصف الدولہ بہادر نے لکھنؤ میں قیام اختیار کرلیا اور یہیں بیٹھے بیٹھے ماں کو ستایا کرتے اور بار بار اُن سے روپیا طلب کرتے۔

بہو بیگم صاحبہ کے موجود رہنے سے، فیض آباد کو اُن کی زندگی تک تھوڑی بہت رونق حاصل رہی۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں بھی نواب آصف الدولہ کی نالائقیوں نے بیگم صاحبہ کے اطمینان میں اور اس کی وجہ سے فیض آباد کے امن و امان میں خلل ڈالا، مگر اُس محترم خاتون کی زندگی تک، وہ جھگڑے اور ہنگامے بھی ایک گونہ باعثِ رونق ہوجایا کرتے تھے۔ اُن کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہوگئی اور لکھنؤ کا دور شروع ہوا جس کا حال ہم آیندہ لکھیں گے۔

(۲)

ٹھیک کسی کو نہیں معلوم کہ لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی؟ اس کا بانی کون تھا؟ اور وجہِ تسمیہ کیا ہے؟ لیکن مختلف خاندانوں کی قومی روایتوں اور قیاسات سے

کام لے کر، جو کچھ بتایا جا سکتا ہے، یہ ہے:

کہتے ہیں، راجا رام چندر جی، لنکا کو فتح کر کے اور اپنے بن باس کا زمانہ پورا کر کے جب سریہ جہاں پناہی پر جلوہ افروز ہوئے، تو یہ سرزمین انھوں نے جاگیر کے طور پر اپنے ہم سفر و ہم درد بھائی لچھمن جی کو عطا کر دی۔ چنانچہ انھی کے قیام یا ورود سے یہاں دریا کنارے ایک اونچے ٹیکرے پر ایک بستی آباد ہو گئی، جس کا نام اُس وقت سے لچھمن پور قرار پایا، اور وہ ٹیکرا، لچھمن ٹیلا مشہور ہوا۔ اُس ٹیلے میں ایک بہت ہی گہرا غار یا کنواں تھا، جس کی کسی کو تھاہ نہ ملتی تھی اور لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ سیس[1] ناگ تک چلا گیا ہے۔ اِس خیال نے جذباتِ عقیدت کو حرکت دی اور ہندو لوگ خوش اعتقادی سے جا جا کے اس میں پھول پانی ڈالنے لگے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہاراجا جودھشتر کے پوتے، راجا جنم جے نے، یہ علاقہ مرتاض بزرگوں، رشیوں اور منیوں کو جاگیر میں دے دیا تھا۔ جنھوں نے یہاں چپے چپے پر اپنے آشرم بنائے اور ہر کے دھیان میں مصروف ہو گئے۔ ایک مدّت کے بعد ان کو کم زور دیکھ کے، دو نئی قومیں ہمالیہ کی ترائی سے آ کے اس ملک پر قابض ہو گئیں، جو باہم ملتی جلتی اور ایک ہی نسل کی دو شاخیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک، بھر اور دوسری، پانسی۔

انھی لوگوں سے، سید سالار مسعود غازی سے ۴۵۹ھ محمدی (۱۰۳۶ء) میں مقابلہ ہوا۔ اور غالباً انھی پر بختیار خلجی نے ۶۳۱ھ محمدی (۱۲۰۲ء) میں چڑھائی کی تھی۔ لہٰذا اس سرزمین پر جو مسلمان خاندان پہلے پہل آ کے آباد ہوئے، وہ انھی دونوں حملہ آوروں خصوصاً سید سالار مسعود غازی کے ساتھ آنے والوں میں سے تھے۔

---

[1] ہندو دیومالا میں سیس ناگ اس ہزار سر والے سانپ کا نام ہے جو دھرتی (زمین) کو اپنے پھن پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اور قدرت و عظمتِ الٰہی کا ایک واجب الاحترام مظہر ہے۔

بھر اور پانسیوں کے علاوہ، برہمن اور کایستھ بھی یہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان سب لوگوں نے مل کے یہاں ایک چھوٹا سا شہر بسا لیا اور امن و امان سے رہنے لگے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بستی کا نام لچھمن پور سے بدل کے، لکھنؤ کب ہو گیا۔ اس آخری مروّجہ نام کا پتا، شہنشاہ اکبر سے پہلے نہیں چلتا۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو مسلمانوں کی کافی آبادی پہلے سے موجود تھی۔ جس کا ثبوت اُس واقعے سے ہو سکتا ہے، جو شیوخِ لکھنؤ کی خاندانی روایتوں میں بہت پہلے سے موجود ہے کہ ۹۶۹ھ محمدی (۱۵۶۱ء) میں جب ہمایوں بادشاہ کو شیر شاہ کے مقابل جون پور میں شکست ہوئی، تو وہ میدان چھوڑ کے، سلطان پور، لکھنؤ، پیلی بھیت ہوتا ہوا بھاگا تھا۔ لکھنؤ میں اُس نے صرف چار گھنٹے دم لیا تھا اور گو کہ شکست کھا کے آیا تھا اور کوئی قوت و حکومت نہ رکھتا تھا مگر لکھنؤ کے لوگوں نے محض انسانی ہمدردی اور مہمان نوازی کے خیال سے، اُن چند گھنٹوں ہی میں دس ہزار روپیا اور پچاس گھوڑے اُس کی نذر کیے تھے۔ اتنے تھوڑے زمانے میں اُس سامان کے فراہم ہو جانے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن دنوں یہاں معتدبہ آبادی موجود تھی۔ اور اُن دنوں کا لکھنؤ، آج کل کے اکثر قصبات سے زیادہ بارونق اور خوش حال تھا۔

اُسی قدیم زمانے کے آنے والوں میں شاہ مینا کا خاندان بھی ہے جن کا مزارِ پُرانوار آج تک مرجعِ انام ہے۔ اور غالباً اُسی عہد کے آنے والوں میں شاہ پیر محمد بھی تھے جنھوں نے خاص لچھمن ٹیلے پر سکونت اختیار کی اور وہیں پیوندِ زمیں ہوئے۔ اُن کے قیام کی وجہ سے وہ پرانا ٹیکرا، لچھمن ٹیلے سے، شاہ پیر محمد کا ٹیلا، ہو گیا۔ اور مرورِ ایام سے وہ گہرا غار بھی پٹ گیا۔ اُس پر بعد کے زمانے میں شہنشاہ اورنگ زیب نے جو بہ نفسِ نفیس یہاں آیا تھا، ایک عمدہ، مضبوط، خوب صورت اور شان دار مسجد بنا کے کھڑی کر دی، جو آج تک عالم گیر کی طرف سے صدائے "اللہ اکبر" بلند کرا رہی ہے۔

۹۹۸ سنہ محمدی (۱۵۹۰ء) میں شہنشاہ اکبر نے جب سارے ہندوستان کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تو صوبۂ اودھ کے صوبے دار یا والی کا مستقر، بادی النظر میں لکھنؤ ہی قرار پایا تھا۔ اُن دنوں اتفاق سے شیخ عبد الرحیم نام ضلعِ بجنور کے ایک خستہ حال و پریشان روزگار بزرگ بہ تلاشِ معاش دہلی پہنچے۔ وہاں امراے دربار میں رسوخ پیدا کر کے بارگاہِ شہنشاہی میں باریاب ہوئے۔ آخر منصب دارانِ شاہی میں شامل ہو کے، لکھنؤ میں جاگیر پائی اور چند روز بعد، بڑے تزک و احتشام اور کرّ و فر سے اپنی جاگیر میں آ کے مقیم ہوئے یہاں خاص لچھمن ٹیلے یا شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر مقیم ہو کے، انھوں نے اپنا پنج محلا بنوایا، شیخن دروازہ تعمیر کرایا اور لکھنؤ ہی میں پیوندِ زمین ہوئے۔ اُن کا مقبرہ نادان محل کے نام سے آج تک مشہور ہے، جس کی عمارت کو ابھی چند روز ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے پسند کر کے، اپنی زیرِ حمایت لے لیا ہے۔

اُسی زمانے میں یہاں شیخ عبد الرحیم نے لچھمن ٹیلے کے پاس ایک دوسری بلندی پر ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کرایا جو قرب و جوار کی گڑھیوں سے زیادہ مضبوط تھا اور گرد و نواح کے لوگوں پر اُس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ یا تو اس لیے کہ شیخ عبد الرحیم کو دربارِ شاہی سے علم ماہی مراتب عطا ہوا تھا، یا اس لیے کہ اُس قلعے کے ایک مکان میں چھبیس محرابیں تھیں، اور ہر محراب پر معمار نے دو دو مچھلیاں بنا کے، باوَن مچھلیاں بنا دی تھیں، اُس قلعے کا نام "مچھی بھون" مشہور ہو گیا۔ بھون کا لفظ، یا تو قلعے کے معنوں میں ہے، یا "باون" سے بگڑ کے بن گیا ہے۔ جس معمار نے اس قلعے کو تعمیر کیا، وہ لکھنا نام کا ایک اہیر تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اسی کے نام سے شہر کا نام لکھنؤ ہو گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ لچھمن پور ہی بگڑ کے، لکھنؤ بن گیا ہے۔ ان میں سے جو بات ہو، مگر اس آبادی نے یہ نام شیخ عبد الرحیم کے آنے کے بعد پایا۔

چند روز بعد شیخ عبد الرحیم کے خاندان والوں یعنی شیخ زادوں کے علاوہ یہاں

پٹھانوں کا ایک گروہ آ گیا، جو جنوب کی طرف بسے اور "رام نگر" کے پٹھان مشہور ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی زمینداری کی حد اُس مقام تک قرار دی تھی جہاں اب گول دروازہ واقع ہے۔ کیونکہ وہاں سے دریا کی طرف بڑھیے تو شیخ زادوں کی زمین شروع ہوتی تھی۔ اُن پٹھانوں کے بعد شیوخ کا ایک نیا گروہ آ کے مشرق کی طرف بس گیا جو شیوخِ نہرہ کہلاتے ہیں۔ اُن لوگوں کی زمین وہاں پر تھی جہاں اب ریزیڈنسی کے کھنڈر پڑے ہیں۔

یہ تینوں گروہ اپنے اپنے علاقوں پر متصرف اور اپنے حلقوں کے حاکم تھے لیکن شیخ زادوں کا اثر سب پر غالب تھا، اور قرب و جوار پر اُن کا دباو پڑتا تھا جس کا قوی سبب یہ تھا کہ یہ لوگ دربارِ دہلی میں رسوخ رکھتے تھے۔ اُن میں سے کئی شخص پورے ملکِ اودھ کے صوبے دار مقرر ہو گئے تھے۔ اور اُن کے قلعۂ مچھی بھون کی مضبوطی کی اس قدر شہرت تھی کہ عوام کی زبان پر تھا: "جس کا مچھی بھون، اُس کا لکھنؤ"۔

اکبر ہی کے زمانے میں لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا۔ اور اس کی آبادی بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ صوبہ دارِ اودھ، اُنھی شیخ زادوں میں سے منتخب ہوئے لیکن عام معمول یہ تھا کہ اس خدمت پر معززینِ دہلی مقرر ہوتے، جو سالوں سال اپنے گھر بیٹھے رہتے، فقط تحصیل وصول کے زمانے میں ایک دورہ سا کرتے، اور اُن کے نائب یہاں رہا کرتے۔ لہٰذا اُن سے شہر کی ترقی کی کوئی امید نہ کی جا سکتی تھی۔ ہاں یہاں کے دو ایک شیخ زادے جو صوبے دار مقرر ہو گئے، تو اُن کے تقرّر سے البتہ لکھنؤ کو فائدہ پہنچا۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو لکھنؤ کی طرف خاص توجّہ تھی چنانچہ اس نے یہاں کے برہمنوں کو، باجپئی چڑھاوے کے لیے ایک لاکھ روپے مرحمت فرمائے تھے، اور اسی وقت سے لکھنؤ کے باجپئی برہمن مشہور ہوئے۔ اسی سے پتا چلتا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم ترین ہندو محلے جو اکبر کے وقت میں موجود تھے، باجپئی ٹولہ، کٹاری ٹولہ، سوندھی ٹولہ، بنجاری ٹولہ

اور اہیری ٹولہ ہیں۔ اور یہ سب چوک ہی کے اطراف میں ہیں۔

مرزا سلیم نے جو تخت پر بیٹھ کے نور الدین جہانگیر کے لقب سے مشہور ہوئے، باپ کی زندگی اور اپنے ایّامِ ولی عہدی میں، مرزا منڈی کی بنیاد ڈالی، جو مچھّی بھون سے مغرب کی طرف واقع ہے۔ اکبر کے آخر عہد میں یہاں کے صوبے دار، جواہر خاں تھے۔ وہ تو دلی میں رہتے مگر ان کے نائب، قاضی محمود بلگرامی نے، چوک کے جنوب میں، اس سے ملے ہوئے، داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کیے۔ اور اُن کے اور چوک کے درمیان میں، بادشاہ کے نام سے، اکبری دروازہ تعمیر کرایا۔

عہدِ اکبری میں جب کہ یہ عمارتیں بن رہی تھیں اور یہ محلّے آباد ہو رہے تھے، لکھنؤ ایک اچھی تجارت گاہ بن گیا تھا۔ اور ترقی کے اس درجے کو پہنچا ہوا تھا کہ ایک فرانسیسی تاجر نے، جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا، یہاں قیام کر کے نفع حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور دربارِ شہنشاہی سے، لکھنؤ کے قیام کے لیے، سندِ مستامنی[۵] حاصل کر کے، یہاں اپنا اصطبل قائم کیا۔ اور پہلے ہی سال میں اس قدر پھلا پھولا کہ چوک کے متّصل، چار عالی شان مکان تعمیر کر لیے۔ سال ختم ہونے پر جب اُس نے پروانۂ مستامنی کی تجدید چاہی، تو اُسے زیادہ قیام کی اجازت نہ ملی۔ اور اس پر بھی اس نے زبردستی ٹھہرنے کا ارادہ کیا، تو حسبُ الحکمِ شہنشاہی حکّامِ شہر نے اُس کے مکانات ضبط کر کے، نزولِ سرکار کر لیے اور اُسے یہاں سے نکال دیا۔ وہ چاروں مکان مدّت تک سرکار کے قبضے میں رہے۔ یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد

۵ مستامن کے معنی طالبِ امن ہیں۔ یورپ والوں کو چونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اپنے لیے خطرہ نظر آیا کرتا تھا، اس لیے جہاں قیام کرنا چاہتے، وہاں کے لیے دربارِ دہلی سے مستامنی کی سند حاصل کر لیا کرتے، تاکہ حکّام وعمّال اور نیز رعایا انھیں نہ ستائے۔ اس سند سے چونکہ سلطنت پر ذمّہ داریاں عائد ہو جاتی تھیں اس لیے ایک سال سے زیادہ کی سند کم دی جاتی تھی۔

میں، جب ملّا نظام الدین سہالوی نے اپنے قصبے کے فسادوں سے عاجز آ کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کا قصد کیا، تو عطیۂ سرکار کے طور پر وہ چاروں مکان انھیں دے دیے گئے، اور انھوں نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ آ کے اُن مکانوں میں سکونت اختیار کی، جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج تک 'فرنگی محل' کہلاتے ہیں۔ ملّا صاحب کے قدوم کی برکت سے لکھنؤ، علم و فضل کا مرکز اور طلبۂ علوم کا مرجع و ماوا بن گیا۔ اور اس علمی مرجعیت کو اس قدر ترقی ہوئی کہ ملّا نظام الدین کا مرتّب کیا ہوا نصابِ تعلیم، جو سلسلۂ نظامیہ کہلاتا ہے، مدّتِ دراز سے ہندوستان ہی کا نہیں، سارے ایشیا کا نصابِ تعلیم ہے اور علمی کمالات کے ساتھ اُس میں ولیانہ برکتیں بھی مضمر تصوّر کی جاتی ہیں۔ اور اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں کہاں کہاں اور کتنی کتنی دور کے طلبۂ علوم لکھنؤ میں جمع رہتے ہوں گے۔

یورپین سیّاح لیکٹ، جو سنہ ۱۰۴۱ ہجری (۱۶۳۱ء) یعنی شاہ جہاں بادشاہ کی سلطنت کے اوائل میں ہندوستان کی سیر کر رہا تھا، لکھنؤ کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ عظیم الشان منڈی ہے۔" عہدِ شاہ جہانی میں یہاں کے صوبے دار، سلطان علی شاہ قلی خاں تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے، مرزا فاضل اور مرزا منصور۔ انھی دونوں کے نام سے اُنھوں نے محمود نگر سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے، دو نئے محلّے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کیے۔

اُس زمانے میں یہاں اشرف علی خاں نام ایک رسالدار تھے، اُنھوں نے اسی سلسلے میں اشرف آباد بسایا۔ اور اُن کے بھائی مشرّف علی خاں نے، نالے کے دوسری طرف اپنا گھر بنا کے مشرّف آباد نام ایک اور محلہ قائم کیا، جس کا نام، مرورِ ایّام سے اب نوبستہ ہو گیا ہے۔ انھی دنوں پیر خاں نام ایک اور فوجی افسر تھے، جنھوں نے ان سب محلّوں سے مغرب کی طرف دور جا کے، اپنی گڑھی بنائی۔ جو مقام (کذا) آج تک پیر خاں کی گڑھی کہلاتا ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا تھا۔

واپسی کے وقت لکھنؤ میں ٹھہرتا ہوا دہلی گیا، اُس موقع پر اُس نے شاہ پیر محمد کے ٹیلے والی مسجد تعمیر کرائی۔ جو خاص کچھمن ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے، ایسی بلندی پر واقع ہے، جس سے زیادہ مناسب جگہ مسجد کے لیے لکھنؤ میں نہیں ہو سکتی۔ اور غالباً اسی موقع پر اس نے فرنگی محل کے مکانات، علامۂ زماں ملّا نظام الدّین کی نذر کیے ہوں گے۔

محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں لکھنؤ کا صوبے دار گردھاناگا نام ایک بہادر ہندو رسالدار تھا۔ اُس کا چچا چھبیلے رام، دربارِ دہلی کی طرف سے الٰہ آباد کی حکومت پر مامور تھا۔ چھبیلے رام کے مرنے پر گردھاناگا نے سرکشی اختیار کی اور ارادہ کیا کہ چچا کی جگہ زبردستی الٰہ آباد کا حاکم ہو جائے۔ مگر پھر خود ہی کچھ سوچ کے اُس نے اظہارِ اطاعت و فرماں برداری کیا، اور دربار سے اُسے اودھ کی صوبے داری کا خلعت عطا کیا گیا۔ اس نے یہاں کی سکونت اختیار کی۔ اور اس کی بی بی نے جو رانی کہلاتی تھی، رانی کٹرہ آباد کیا۔

مگر یہاں کا حاکم اور صوبے دار چاہے کوئی ہو، شیخ زادوں کا اس قدر زور تھا کہ کسی والی کو، چاہے کیسا ہی زبردست ہو اور کیسی ہی سندِ حکمرانی لے کے آیا ہو، یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ اُن کے حلقے میں قدم رکھے۔ مچھّی بھون کو اگرچہ قصرِ امارت کی حیثیت حاصل تھی لیکن شیخ زادوں نے اُسے اپنی موروثی جایداد بنا لیا تھا، اور دہلی سے جو والی آتا، اس کے پاس پھٹکنے نہ پاتا۔ انھوں نے مچھّی بھون کے پاس دو اور عمارتیں تعمیر کر لی تھیں جن میں سے ایک کا نام مبارک محلا تھا۔ اور دوسری کا نام، پنچ محلا تھا۔ پنچ محلے کی نسبت کوئی کہتا ہے کہ پنج منزلی عمارت تھی اور کوئی کہتا ہے کہ ایک دوسرے کے پاس پانچ محل بنے ہوئے تھے۔ اور اُن کے جنوب طرف ایک بڑا محراب دار پھاٹک تھا جو شیخن دروازہ کہلاتا۔ شہر سے جو لوگ شیخ زادوں کی مذکورہ عمارتوں میں جانا چاہتے، اسی پھاٹک میں سے ہو کے گزرتے۔

اِس پھاٹک کے محراب میں بانکے شیخ زادوں نے ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی اور

حکم تھا کہ جو کوئی یہاں آنا چاہے، کوئی ہو اور کتنا ہی بڑا شخص ہو، پہلے اس تلوار کو جھک کے سلام کر لے، پھر آگے قدم بڑھائے۔ کس کی مجال تھی کہ اس حکم کی تعمیل میں عذر کرے؟ یہاں تک کہ دہلی سے جو والی اور حاکم مقرر ہو کے آتے تھے اور شیخوں سے ملنے جاتے، تو اُنھیں بھی جبراً و قہراً اُس تلوار کے آگے ضرور سر جھکا دینا پڑتا۔

لکھنؤ کی یہ حالت تھی کہ ۱۱۶۱ھ محمدی (۱۷۴۸ء) میں نواب سعادت خاں بُرہان الملک، دربارِ دہلی سے اودھ کے صوبے دار مقرر ہو کے آئے، جن سے ہندوستان کے اُس آخری مشرقی دربار کی بنیاد پڑی، جس کے عروج کو، ہم مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ قرار دے کے، بیان کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے نمبر میں ہم نے فیض آباد کی حالت دکھائی جو اسی تمدّن کا نقشِ اوّلیں اور اسی مشرقی دربارِ لکھنؤ کا ایک ضمیمہ تھا۔ اس نمبر میں اس دربار کے قائم ہونے سے پیشتر کے لکھنؤ کی تصویر دکھا دی۔ اور اُس بساط کو اپنے ناظرین کے پیشِ نظر کر دیا جس پر اس دربار نے اپنی شطرنج بچھائی۔ آیندہ چند نمبروں میں ہم اس نیشاپوری خاندان کی تاریخِ حکومت بیان کریں گے۔ اور اس کے بعد دکھائیں گے یہ تمدّن کیا اور کیسا تھا۔

(۳)

نوّاب سعادت خاں بُرہان الملک کے خاندان کے متعلق اسی قدر بتا دینا کافی ہے کہ میر محمد نصیر نام، نیشاپور کے ایک سیّد زادے، جن کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظمؑ سے ملتا ہے، ۱۱۳۵ھ محمدی (۱۷۲۲ء) عہدِ بہادر شاہ میں وارد ہندوستان ہوئے۔ ان کے بڑے بیٹے میر محمد باقر ساتھ آئے تھے۔ جنھوں نے یہاں شادی کر لی اور باپ بیٹوں نے ناظمِ بنگالہ کی زیرِ حمایت عظیم آباد پٹنہ میں سکونت اختیار کی۔ محمد باقر کو ہندوستان کی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا جو بعد کو شیر جنگ کے معزّز لقب سے مشہور ہوا۔

میر محمد نصیر کے آنے کے دو سال بعد، اُن کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین بھی نیشاپور سے ہندوستان میں آ گئے۔ عظیم آباد پہنچے تو سُنا کہ والد نے سفرِ آخرت کیا۔ اور اب دونوں بھائی